رابعہ عاشق*

معاصر اردو افسانے میں سماجی و ثقافتی رویے

Social and Cultural Behaviours in the Contemporary Urdu short story

Abstract:

The rapid advancement of technology, along with the expansion of consumerism and globalization, has engendered profound transformations in social institutions as well as in social and cultural values since the late twentieth century. To examine the literary implications of these transformations, this paper undertakes a critical analysis of selected short stories by Ikramullah, Asad Muhammad Khan, Asif Farrukhi, Muhammad Hameed Shahid, Nasir Abbas Nayyar, Neelam Ahmad Bashir, Aasim Butt, and Ali Akbar Natiq. The study demonstrates that contemporary Urdu short fiction foregrounds, on the one hand, themes such as intolerance, social apathy, fear, political oppression and exploitation, cultural conflict, and social inequality. On the other hand, it also articulates affirmative values including humanism, empathy, gender equality, sincerity, and love. Consequently, contemporary Urdu short fiction not only offers a critical interrogation of shifting socio-cultural values but also contributes to the cultivation of intellectual awareness and social consciousness among its readerships.

Keywords: Socio-cultural changes, Urdu short stories, globalization, social inequality, cultural conflict, social consciousness.

اس مقالے میں بیسویں صدی کی آخری دہائی سے لمحہ حال تک تخلیق پانے والے افسانے کو معاصر اردو افسانے کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ اس کے تحت اکرام اللہ، اسد محمد خان، آصف فرخی، محمد حمید شاہد، ناصر عباس نیّر، نیلم احمد بشیر، عاصم بٹ اور علی اکبر ناطق کے منتخب افسانوں کا مطالعہ کیا گیا ہے تا کہ معاصر اردو افسانے میں سماجی و ثقافتی رویّوں کی نوعیت اور معنویت کو واضح کیا جا سکے۔

اردو افسانے میں سماجی و ثقافتی رویّوں کا جائزہ لینے سے قبل ضروری ہے کہ سماج و ثقافت کے مفاہیم اور ان کے باہمی تعلق کو مختصر طور پر بیان کیا جائے۔ کسی مخصوص جغرافیائی خطے میں طے شدہ قواعد و ضوابط کے تحت منظم زندگی بسر کرنے والے انسانوں کے گروہ کو سماج کہا جا سکتا ہے۔ سماج کے بنیادی تشکیلی عناصر میں افراد معاشرہ، مشترکہ ثقافت، سماجی تعلقات، سماجی ادارے، مشترکہ مفادات و مقاصد شامل ہیں۔

رے منڈ ولیمز(Raymond Williams۔۱۹۲۱ء-۱۹۸۸ء) نے ثقافت کو ایک مکمل طرزِ حیات قرار دیا ہے۔ انیسویں صدی میں ثقافت کا اطلاق زیادہ تر، فنونِ لطیفہ جیسے موسیقی، ادب اور مصوری تک محدود تھا۔ تاہم ولیمز نے اس محدود تصور پر تنقید کرتے ہوئے ثقافت کے دائرے میں سماج، سیاست اور عام انسان کی روزمرہ زندگی کو شامل کیا۔ یوں ثقافت کے تصور کی تشکیل میں ادب و فن کے ساتھ ساتھ عام آدمی کی عادات، اقدار، طرزِ فکر اور سماجی رویّے بھی مرکزی حیثیت اختیار کر گئے[۱]۔ اس طرح سماج و ثقافت میں نہایت گہرا اور دوطرفہ تعلق قائم ہوتا ہے؛ سماج، ثقافت کی بنیاد فراہم کرتا ہے اور ثقافت، سماج کی شناخت قائم کرنے میں کردار ادا کرتا ہے۔ یہ دونوں باہم مل کر انسانی تہذیب کو تشکیل دیتے اور پروان چڑھاتے ہیں۔

۱۹۹۰ء کے بعد ہمارے سماج میں ایسی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں جنھوں نے سماجی و ثقافتی زندگی کا رخ بدل دیا۔ بیسویں صدی میں اشتراکی نظام، سرمایہ دارانہ نظام کے متبادل کے طور پر ابھرا، جس کے نتیجے میں دنیا دو بڑی طاقتوں: سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان منقسم رہی۔ ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد یہ دو قطبی نظام ختم ہوا اور سرمایہ داریت کے نمائندہ ملک امریکہ نے واحد عالمی طاقت کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس تبدیلی نے خصوصاً ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک پر گہرے اثرات مرتب کیے، جن میں قومی خودمختاری کا بحران، سیاسی عدم استحکام، گروہی تقسیم، معاشی انحصار، قرضوں کی بھرمار، افغان جہاد، طبقاتی تفاوت اور انصاف کی عدم فراہمی جیسے مسائل شامل ہیں۔ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کے بعد دہشت گردی، تشدّد، خوف، عدم تحفّظ، خانہ جنگی، اور ریاستی و سماجی جبر جیسے مسائل نے سماجی رویّوں کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔ اسی دوران سماجی ذرائع ابلاغ، عالمگیریت، ترکِ وطن کے رجحان اور صارفی ثقافت نے سماج کو نئی حقیقتوں سے روشناس کرایا۔ یہی حقیقتیں معاصر سماجی و ثقافتی رویّوں کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔

معاصر اردو افسانہ اپنے عہد کی اسی سماجی و ثقافتی صورتِ حال کا تخلیقی اظہار ہے۔ بقول ڈاکٹر بشیر سیفی: ”جدید علوم جس طرح زندگی پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور جدید دور کا انسان جن نفسی اور مادی تبدیلیوں سے دوچار ہے نیا افسانہ اسے بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے“[۲]۔ زیرِ مطالعہ افسانوں میں نہ صرف سماجی ناہمواری، اقدار کا زوال، فرد کی تنہائی، خوف، تشدد، عدم برداشت اور جبر جیسے مسائل نمایاں ہیں بلکہ سماجی و ثقافتی سطح پر کچھ مثبت رویّوں کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نو استعماریت اور

عالمگیریت کے دباؤ کے تحت خطرے سے دوچار مقامی شناخت بھی معاصر افسانہ نگاروں کی توجہ کا مرکز بنی ہے۔

معاصر صورت حال نے دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ انفرادی و اجتماعی زندگی میں بے حسی اور لا تعلّقی کو جنم دیا ہے۔ انسانی ہمدردی، اخوّت، احساس ذمہ داری، حقوق العباد کی پاس داری جیسی دل کش روایات ہماری ثقافت کا حصّہ تھیں جو اب زوال پذیر ہیں۔ آصف فرخی کے افسانے ''آج کا مرنا''[۳] حمید شاہد کے ''کہانی اور کرچیاں''[۴]، رفیع حیدر انجم کے ''سفر ایک شہر کا''[۵] اور اکرام اللہ کے افسانے ''پل اور نقلی چوکیدار''[۶] میں سماجی و ثقافتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

آصف فرخی کے افسانے ''آج کا مرنا'' کی کہانی بڑے شہر کی فضا میں جنم لیتی ہے جہاں ہر فرد اپنی دھن میں مگن ہے۔ وہ دوسرے لوگوں، ماحول اور اپنے اردگرد موجود تمام اشیاحتٰی کہ اپنے کلچر اور مذہبی اقدار سے بھی بیگانہ ہے۔ مادی ترقی کے اثرات سب سے پہلے اور سب سے زیادہ بڑے شہروں کی سماجی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی نے انسان کی زندگی کو سہل بنایا، فاصلوں کو سمیٹتے ہوئے دنیا کے مختلف خطّوں میں رہنے والے انسانوں کے مابین روابط کو ممکن بنایا، معاشی ترقی کے نئے راستے بھی کھولے لیکن دوسری طرف سماجی و ثقافتی زندگی کو تہہ و بالا کر دیا۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی: ''ہر چیز کی اہمیت زیروزبر ہے۔ ساری جمی جمائی اقدار ٹوٹ پھوٹ کر ایک ڈھیر بنتی جارہی ہیں''۔[۷]

افسانہ ''آج کا مرنا'' میں بھی اسی ٹوٹ پھوٹ کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس افسانے میں ایک سڑک کے کنارے بلّیوں کو کھانا کھلانے والی عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے جو سڑک کے کنارے ہی اپنی زندگی کی آخری سانس لیتی ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ اس کی موت پر نہ سماج چونکتا ہے اور نہ ہی اجتماعی ضمیر میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ عورت دو دن تک مردہ پڑی رہتی ہے ؛ کوئی اس کی خبر گیری نہیں کرتا۔ افسانے کی کہانی صیغہ واحد متکلم میں بیان کی گئی ہے۔ بیان کنندہ روزانہ اسی سڑک سے گزرتے ہوئے ایک بلّیوں والی مائی کو دیکھتا ہے جو سڑک کے کنارے میلے کچیلے لباس میں بیٹھی ہوتی ہے۔ ایک روز معمول کے مطابق وہاں سے گزرتے ہوئے اسے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بوڑھی عورت مر چکی ہو۔ وہ اس واقعے کی اطلاع پولیس کو دیتا ہے مگر پولیس اس پر کوئی توجّہ نہیں دیتی۔ پولیس کا غیر سنجیدہ اور بے اعتنائی پر مبنی رویّہ اس حقیقت کو مزید نمایاں کر دیتا ہے کہ اس عورت کی زندگی، سماجی سطح پر، کبھی بھی کسی اہمیت کی حامل نہ تھی۔ بعد ازاں اس واقعے کا بیان کنندہ گھر جاتا ہے اور اپنی ان دنوں کی یادوں میں کھو جاتا ہے جب وہ نیویارک میں رہائش پذیر تھا۔ گیارہ ستمبر کے سانحے کے بعد اس کو اپنا شہر کراچی شدّت سے یاد آنے لگا تو وہ اپنی شناخت کی تلاش میں واپس کراچی چلا آیا۔ اسے یاد تھا کہ اسی شہر میں رہتے ہوئے اس نے بڑے بڑے خواب بُنے تھے لیکن اب کراچی بدل چکا تھا۔ جدید زندگی نے شہر کی عمارتوں میں تبدیلی کے ساتھ انسانوں کے دلوں میں بھی مفاد پرستی اور خود غرضی کو جنم دیا ہے۔ اس شہر میں اجتماعی بے حسی اور سماجی ناہمواری کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں جہاں ایک جیتے جاگتے انسان کی موت محض خبر یا تماشا بن چکی تھی۔

افسانے کے اختتام پر بلّیوں والی مائی کی موت محض ایک فرد کی موت نہیں بلکہ اجتماعی بے حسی کی علامت ہے۔ بیان کنندہ اس صورتِ حال کو یوں بیان کرتا ہے: "وہ اپنی موت تک پہنچ چکی ہے اور شہر اس کے گرد گول گول گھوم رہا ہے، چکّر کاٹ رہا ہے، کبھی کسی کے لیے نہ رکنے والا، کبھی کسی کو یاد نہ کرنے والا۔ اسے موت کی کیا خبر؟"[۸]

بیسویں صدی کے اواخر میں سرمایہ دارانہ سماج کی جگہ صارفی سماج لینے لگا۔ یہ سرمایہ دارانہ سماج ہی کی نئی شکل ہے۔ اس میں پیداوار طلب کے مطابق نہیں ہوتی بلکہ پہلے اشیا پیدا کی جاتی ہیں پھر صارفین کو اشتہاروں کے ذریعے ان اشیا کو خریدنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ مادی خواہشات کی بہتات اور ان کی تعبیر کے لیے شب و روز مصروف انسان انسانی احساسات اور جذبات سے محروم ہو جاتا ہے۔ آصف فرخی نے زیر بحث افسانے میں اسی تلخ سماجی رویےّ کو اجاگر کیا ہے۔ بلّیوں والی مائی کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ وہ دو روز تک سڑک پر مردہ حالت میں پڑی رہتی ہے مگر بیان کنندہ، پولیس اور ارد گرد کے دیگر لوگوں کے معمولات زندگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سماجی بے حسی کی ایک شکل رفیع حیدر انجم کے افسانے "سفر ایک شہر کا" میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس افسانے میں شہر کو ایک علامت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے فرد کے باطن میں موجود تاریکی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مادی ترقی اور جدید طرز زندگی نے شہر کی عمارتوں میں تبدیلی کے ساتھ انسان کے دلوں میں بھی بے حسی اور خود غرضی کو جنم دیا۔ افسانے میں ہر فرد اپنی دھن میں مگن دوسرے لوگوں اور اپنے ارد گرد موجود تمام اشیا سے یکسر انجان ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس دیکھیے:

> شہر کی تبدیلیوں نے لوگوں کو کتنا اجنبی اور لاتعلق بنا دیا ہے! ہر شخص مشینی انداز میں کسی انجانی منزل کی سمت نگاہیں جمائے تیز رفتاری سے فاصلہ طے کر رہا ہے لیکن وہ منزل کون سی ہے؟ یہ فاصلہ کب ختم ہو گا؟ میں خود بھی تو نہیں جانتا کہ اب تک کتنا فاصلہ طے کر چکا ہوں۔[۹]

سرمایہ دارانہ نظام بیگانگی کو جنم دیتا ہے جہاں انسان اپنی محنت، اپنی ذات اور اپنے معاشرے تینوں سے دور ہو جاتا ہے۔ محولہ بالا اقتباس میں اجتماعی بے حسی اور بیگانگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ ایک ایسے معاشرے کی صورت حال کو بیان کیا گیا جہاں بسنے والوں کو اپنے عمل اور اپنی خواہشات پر کوئی اختیار نہیں ہے؛ انھیں اپنے سفر کی منزل کا پتا ہے اور نہ یہ اپنے سفر میں اپنے پورے وجود کے ساتھ شریک ہیں۔ عاصم بٹ نے اپنے افسانے "عہد گزشتہ کی کہانی"[۱۰] میں ایک ایسے فرد کی کہانی بیان کی ہے جو تنہا کمرے میں چوہے کے کاٹنے سے مر جاتا ہے۔ چوہے کے ذریعے موت اور روپوش سورج کا ذکر سماجی توازن بگڑنے کی علامت ہے۔ جہاں اجتماعی بے حسی اور بیگانگی اپنے پنجے گاڑے بیٹھی ہے۔

اردو افسانے میں ایک فرد کی بے حسی اور اپنے فطری و حیاتیاتی رشتوں سے لاتعلقی کی مثالیں موجود ہیں جیسا کہ حیات اللہ انصاری کے افسانے "آخری کوشش"[۱۱] میں ماں سے بیٹوں کی لاتعلقی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ حمید شاہد نے اپنے افسانے "کہانی اور

کرچیاں" میں ایک باپ کی بے حسی کے ساتھ ساتھ ماں کی محبت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اس افسانے میں کبیری کردار اپنے گھر کی ملازمہ کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتا ہے مگر بچّے کی پیدائش کے بعد اس کو سماج میں اپنی عزّت کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ اس کو مارنے کی کوشش کرتا ہے۔ افسانے میں عورت کا کردار ایک مضبوط ماں کا کردار ہے جو اپنے بیٹے کی خاطر تمام مظالم برداشت کرتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو اس کے باپ اور معاشرے کے ظلم سے بچانے کی کوشش کرتی ہے جب کہ مرد اپنی بے حسی کے ذریعے اپنی جھوٹی شان و شوکت اور انا کی تسکین چاہتا ہے۔ یہاں سماجی بے حسی اور ثقافتی زوال کے مقابل ماں کی بے لوث محبّت ہے۔ ماں کی محبت فطرت کی علامت ہے جب کہ بے حسی اور اخلاقی اقدار کا زوال انسان کی مادی ترقی سے منسلک ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے افسانہ نگار فطرت کے ساتھ مضبوط رشتے میں عہد حاضر کے انسان کی نجات دیکھتا ہے۔

اکرام اللہ کا افسانہ "پُل اور نقلی چوکیدار" ایک علامتی افسانہ ہے جس میں ایک وسیع پل اپنی روشنی، بلند ستونوں اور جالی نما ساخت کے ذریعے انسانی زندگی اور معاصر معاشرتی رویوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ پُل کے ستون آسمان کی بلندیوں تک اٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور آپس میں جُڑ کر ضرب کے نشانات والا ایک جال تشکیل دیتے ہیں۔ یہ جال طاقت کے غیر مرئی بہاؤ، جبر کے نظام اور معاشرتی بگاڑ کی علامت بن جاتا ہے۔ اس منظر میں انسانوں کا ایک ہی سمت میں حرکت کرنا اور ان کے چہرے پر خوف کا نمایاں تاثر انسان کی وجودی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں انسان خوف کے زیرِ اثر اپنے ذاتی مفاد اور بقا کو اپنی اوّلیں ترجیح بنالیتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد رونما ہونے والے حالات و واقعات، سماجی ناانصافیوں اور اخلاقی انحطاط کو دیکھتے ہوئے بھی بے اعتنائی اور لاپروائی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

افسانے میں نقلی چوکیدار خوف اور جبر کی علامت ہیں۔ ان کا جامنی رنگ، جبڑے اور مختلف عجیب و غریب نقوش انسانی جذبات کے عدم توازن اور سماجی دباؤ کو ظاہر کرتے ہیں۔ بانس اٹھانے والے اور ان پر موجود نقلی چوکیدار، نیز ان کے بے شمار چہروں کا ذکر دراصل معاشرے میں ریاکاری، منافقت اور دوغلے پن کو بیان کرتا ہے: "ہر پتلے کے کم از کم دو چہرے ہیں۔ کئی پتلے تو ایسے ہیں جن کے آٹھ آٹھ دس دس چہرے ہیں اور ہر چہرے پر ایک الگ تاثر طاری ہے"[۱۲]۔ افسانے میں سماجی بے حسی اور انسانی تعلّقات کی پامالی نمایاں ہے۔ پُل پر چلنے والے افراد اپنی ذاتی حفاظت میں مصروف ہیں اور دوسروں کے دکھ تکلیف سے بے نیاز ہیں۔ اس بے حسی میں والدین اور بچّوں کے تعلّقات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ والد بچّوں کی حفاظت جیسی ذمہ داری چھوڑ کر پُل کے دوسرے حصّے کی طرف چلے جاتے ہیں۔ والدین کی محبّت کی عدم موجودگی بچّوں کی معصومیت کو مجروح کرتی ہے جس سے تعلّقات کے حقیقی معنی جیسے پیار، اعتماد اور قربانی کی قدر ختم ہو جاتی ہے۔ افراد اپنے ذاتی مفاد کے تابع ہو جاتے ہیں؛ محبّت یا رشتوں میں خود غرضی اور مفاد پرستی کا رویّہ غالب آجاتا ہے۔ افسانے میں بچّی اپنے والد کے حوالے سے کہتی ہے:

میرا تو کوئی رکھوالا نہیں، ایک باپ تھا وہ بغیر کچھ پیچھے چھوڑے ادھر کود گیا۔۔۔ہائے اگر وہ پیچھے بہت سامال چھوڑ جاتا تو کتنا مزا آتا۔[۱۳]

افسانے میں عورت کا بچّی کے سر پر ڈگڈگی بجانا اور ہانک لگانا دراصل اسے حریصانہ نظروں سے بچانا ہے، عورت کا یہ عمل ہمدردی کی علامت ہے لیکن اس ہمدردی پر ذاتی مفاد سبقت لے جاتا ہے اور وہ واپس اپنے جنگلے کے پاس چلی جاتی ہے۔ ہر انسان اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتا ہے جس کی وجہ سے پیار اور محبت کے جذبات بے معنی ہو رہے ہیں۔

ناصر عباس نیّر کے افسانے ”عقیدہ آدمی کا ہوتا ہے لاش کا نہیں“[۱۴] میں مذہبی شدت پسندی، سیاسی و سماجی جبر و استحصال کی عکاسی کی گئی ہے۔ افسانہ مذہبی عدم رواداری کے معاشرتی زندگی اور لوگوں کے رویّوں پر اثرات کو بیان کرتا ہے۔ صفدر حسن صدیقی اجتماعی زندگی میں پیدا ہونے والی زیادہ تر خرابیوں کا سبب مذہبی عدم رواداری کو قرار دیتے ہیں۔[۱۵] زیر بحث افسانے میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اشیا، نظریات اور تصوّرات کو بغیر سوچے سمجھے قبول نہیں کرتا بلکہ نظام اور مقتدرہ پر سوال اٹھاتا ہے۔ وہ اپنی نئی کتاب میں ایک جگہ لکھتا ہے: ”جس کے کندھوں پر لاکھوں جانوں کا بوجھ ہے اسے رات کو نیند نہیں آتی“[۱۶]۔ اس سچ کے بعد قاضی اسے زہر دے کر مارنے کا اعلان کرتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد مزید کتابیں برآمد ہوتی ہیں تو خلیفہ کو لگتا ہے کہ زہر کے ذریعے دی گئی موت آسان ہے جب کہ اس کی کتابیں ابھی بھی کفر پھیلا رہی ہیں۔ لہٰذا اب مرنے کے بعد اس کی لاش کو تشدد کا نشانہ بنایا جائے تاکہ دیگر لوگ بھی عبرت پکڑیں۔ ایک نوجوان اس میں حائل ہوتے ہوئے کہتا ہے کہ: ”عقیدہ آدمی کا ہوتا ہے لاش کا نہیں“۔ روکنے والے نوجوان کا یہ احساس ایک مثبت سماجی رویّہ ہے تاہم اس کا یہی رویہ اس کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ لاش کو قبر سے نکال کر بہت بُری طرح مجروح کیا جاتا ہے۔ بستی کے تمام لوگ بھی اس تشدّد میں برابر کے شریک ہیں کیوں کہ وہ بھی اپنے تئیں کفر کو پھیلنے سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

افسانے میں اس بات کا واضح اظہار ملتا ہے کہ طاقت ور طبقہ محض اپنی طاقت اور اقتدار کو بچانے کے لیے لوگوں میں مذہبی تعصّبات اور کشیدگی کو جنم دیتا ہے۔ آمریت کو مستحکم کرنے کے لیے مذہب کو ہتھیار بنایا جاتا ہے۔ علم و ہنر یا فکری رویّہ رکھنے والوں کو نیست و نابود کرتے ہوئے عبرت کا نشان بنایا جاتا ہے تاکہ آئندہ کوئی بھی اپنے لفظوں، اپنی کتابوں اور اپنے سوالوں کے ذریعے معاشرے میں فکری و معروضی رویّوں کو فروغ دینے کا نہ سوچے۔ ایک کتاب میں یہ امکان موجود رہتا ہے کہ وہ سماجی وجود میں سوالوں کی پرورش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں کتب خانے جلائے جانے کے واقعات ملتے ہیں۔ اسی طرح افسانے میں کتابوں کو جلانا، شاگردوں کا خاموشی سے حکم ماننا؛ دوبارہ کچھ بولنے اور لکھنے پر پابندی لگانا اور اختلاف رائے رکھنے والے کو موت کے گھاٹ اتارنا مقتدرہ کے وہ ہتھکنڈے ہیں جنھیں مذہبی لبادہ اوڑھا کر رعایا کو سوچنے سمجھنے کی حس سے محروم رکھا جاتا ہے؛ ان کے

ذہنوں پر حکومت کی جاتی ہے۔ غیر منطقی اور غلام ذہن معاشرے میں سفّاکیت، تشدّد اور شدّت پسندی پر مبنی رویوں کی آب یاری کرتے ہیں۔ مذہب ہمارے سماجی و ثقافتی رویّوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ایک طرف طاقت ور طبقات عوام کے مذہبی جذبات کو استعمال کرتے ہوئے اپنے مفادات و مقاصد کا تحفّظ کرتے ہیں تو دوسری طرف عام آدمی کا مذہب بھی توہم پرستی کا شکار ہے۔ مذہب کی روح کو سمجھنے کے بجائے ہم اپنے مالی اور مادی مفادات کے حصول کے لیے اس کو ایک ذریعہ بناتے ہیں۔ پیروں کے آستانے پر حاضری دینا، ان سے دعا کروانا، تعویز لکھوانا، چلّے کاٹنا، وظیفے پڑھنا وہ عام رویّے ہیں جن کا ہم اپنی روز مرہ زندگی میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہم اپنی تمام مشکلات کا حل محنت کے بجائے انھی وظائف میں ڈھونڈتے ہیں۔ اسی رویّے کو عاصم بٹ نے اپنے افسانے "انتظار"[۱۷] میں اجاگر کیا ہے۔

والدین کی عزت و احترام ہمارے معاشرے کی ایک خوب صورت قدر رہی ہے۔ جیسے جیسے زندگی اپنا رنگ بدلتی گئی، مادیت پرستی نے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ رشتوں میں دوری اور فاصلہ بڑھتا گیا۔ معاصر افسانے نے اس بحران کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں محمد حمید شاہد کے افسانے "جنریشن گیپ"[۱۸] اور "اپنا سکہ"[۱۹] کو دیکھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ان افسانوں میں مکالماتی تکنیک استعمال کرتے ہوئے نئی اور پرانی نسل میں بڑھتے ہوئے فاصلوں کی نشان دہی کی ہے۔ پرانی نسل اپنی ثقافت اور مٹّی سے جڑی ہوئی ہے جب کہ نئی نسل اپنی ثقافتی اقدار سے بے نیاز مادی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ مادی ترقی کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے اسے زمین کی چیزیں اور اپنی معاشرتی اقدار بہت چھوٹی محسوس ہوتی ہیں۔ دونوں افسانوں کی کہانی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جدید زندگی نے انسان سے اس کی روایتی قدروں کو چھینتے ہوئے نئی قدروں سے روشناس تو کروایا لیکن ان جدید قدروں نے آنے والی نسل کی نظروں میں بڑوں کے لیے عزّت و احترام جیسے عناصر کو یکسر ختم کر دیا ہے۔ بچّے والدین کے ساتھ غفلت آمیز رویّہ اختیار کرتے ہیں؛ ان کی بات کو ان سنا کرتے ہوئے اپنی من مانی کرتے نظر آتے ہیں۔ جنریشن گیپ میں جاگیر دار اور ملازم کے بیٹے کی کہانی بیان کی گئی ہے جو جدید تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی ذات کو شہر کی رنگینیوں میں گم کرتے ہوئے اپنے والدین کو کم تر اور حقیر سمجھتا ہے:

> میں شہر جارہاہوں بابا مجھے پتا تھا آپ اپنی زمینوں اور بیلوں میں الجھے ہوئے ہوں گے....
> اس لیے کھانا کھا کر آیا ہوں۔ مگر بیٹے... اچھا میں چلا۔
> خدا حافظ۔ مگر بات تو سن لیتے...[۲۰]

افسانے میں نئی نسل کی اپنی مٹّی اور ثقافت سے دوری کے ساتھ اپنی زبان سے انحراف کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اپنی ثقافت اور زبان کے حوالے سے احساس کمتری کا رویہ نو آبادیاتی تسلّط کی دین ہے۔ یہی رویّہ آزادی کے بعد بھی برقرار رہا۔ ہمارے

سماج میں مغربی ثقافت اور انگریزی زبان برتر سماجی حیثیت کی علامات ہیں جب کہ ہم اپنی زبان کے حوالے سے معذرت خواہانہ رویّہ اختیار کیے رکھتے ہیں۔ دیگر زبانیں سیکھنے میں قباحت نہیں لیکن اس کے پس پردہ اپنی زبان کو حقیر سمجھنا ایک افسوس ناک بات ہے۔ افسانے کے ایک کردار کی زبان سے ادا ہونے والے جملے میں انگریزی کا بے محل اور بہت زیادہ استعمال احساس کمتری ہی کی علامت ہے۔

> ایک دم باسٹرڈ ہے۔ ال مینرڈ لیکن- میری اس سے ویڈ بھی ہو گئی تھی۔ مگر مجھے بعد میں ایکسپلور ہوا کہ آدمی اپنے سٹریٹنڈ آرب سے نہ نکلے گا۔[۲۱]

عصرِ حاضر کا عالمگیر مسئلہ سیاسی و سماجی جبر و استحصال ہے جو ہمارے ثقافتی و سماجی روابط کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ کیوں کہ طاقت کا بے محابا استعمال انسانوں کے ایک بڑے طبقے کے استحصال اور سماجی ناہمواری کی وجہ بنتا ہے۔ قانون بھی صرف اُمرا کے لیے بدلتا ہے اور سزائیں مظلوم لوگوں کے حصّے میں لکھ دی جاتی ہیں۔ اس کی حقیقی تصویر ناصر عباس نیّر کے افسانے "پرانا اور نیا نظام انصاف"[۲۲]، آصف فرخی کے "گائے کھائے گُڑ"[۲۳] اور رفیع حیدر انجم کے افسانے "بارش"[۲۴] میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

"گائے کھائے گڑ" میں بچہ جب درست لفظ کی ادائیگی کرنے لگتا ہے تو اس کے ہونٹ پر چٹکی کاٹ دی جاتی ہے۔ "بارش" افسانے میں انسان کی داخلی شکست وریخت کے ذریعے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ سیاسی جبر واستحصال سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح بارش میں مرکزی کردار باہر نہیں جاسکتا۔

> میں تو کسی بڑی مشین کا ادنی سا پرزہ ہوں جو دوسروں کی مرضی کے بغیر اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تو پھر اس بارش میں کیسے باہر نکل جاؤں؟[۲۵]

افسانے کا یہ جملہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں ایک فرد کی بے بسی اور بے اختیاری کو بیان کرتا ہے۔ ایرک فرام (Erich Fromm۔ ۱۹۰۰ء-۱۹۸۰ء) لکھتے ہیں:

> جدید سرمایہ دار چوں کہ محنت کو مستعار لیتا ہے لہذا اس استحصال کی سیاسی اور سماجی صورت بدل گئی ہے۔ تاہم اس امر میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا کہ سرمائے کا مالک اپنے منافع کی خاطر دوسرے انسانوں کو استعمال کرتا ہے۔ استعمال کے بنیادی تصور کا انسانی برتاؤ کے ظالمانہ یا غیر ظالمانہ طریقوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق تو اس بنیادی حقیقت سے ہے کہ ایک آدمی ایسے مقاصد کی خاطر دوسرے آدمی کی خدمت کرتا ہے جو اس کے اپنے نہیں ہیں، بلکہ اسے ملازم رکھنے والے کے ہیں۔ انسان کے ہاتھوں انسان کے استعمال کے تصور کا اس سوال سے بھی کوئی تعلق نہیں کہ آیا ایک آدمی دوسرے کو استعمال کرتا ہے یا خود اپنے آپ کو استعمال کرتا ہے وجہ یہ ہے کہ ہر دو صورتوں میں حقیقت ایک ہی رہتی ہے اور وہ یہ کہ ایک انسان جیتا جاگتا انسان..

بجائے خود مقصد نہیں رہتا بلکہ کسی دوسرے انسان یا خود اپنی ذات یا کسی غیر شخصی ادارے اور معاشی مشین کے معاشی مفادات کا وسیلہ بن جاتا ہے۔[۲۶]

افسانے ''پرانا اور نیا نظامِ انصاف'' میں بادشاہ اور اس کا مشیر اعلیٰ نیا نظام انصاف قائم کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کو ان کی نیّتوں کے عوض سزا دیتے ہیں اور اکتاہٹ دور کرتے ہیں۔ نیا نظام انصاف قائم ہونے کے کچھ عرصے بعد بادشاہ کے دربار میں عورت کا مقدمہ درج ہوا۔ جس پر ناجائز بچّوں کو پالنے کا الزام تھا۔ یہ الزام اس پر پہلے بھی لگا تھا۔ پہلی بار قاضی نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ ان لوگوں کو سامنے لایا جائے جو یہ عمل سرانجام دیتے ہیں۔ اب دوسری بار الزام لگایا گیا تو دربار میں عورت نے جُرات مندی سے کہا کہ میں اگر ناجائز بچّہ پیدا کرنا چاہتی ہوں تو پہلے وہ مرد ڈھونڈا جائے جو اس عمل کی نّیت رکھتا ہے۔ جب بستی کے تمام مردوں کی نیّتوں کو ٹٹولا گیا تو اس میں سرفہرست بادشاہ، اس کے مشیر اور قاضی کا نام تھا۔ ان ناموں کے سامنے آنے کے بعد پرانا قانون بحال کر دیا گیا۔

دو دنوں بعد اس نے اس شہر کے تمام مردوں کے نام پیش کیے جس میں مشیر اعلی، خود اس کا قاضی کا اور بادشاہ کا نام شامل تھا۔ سنا ہے اس کے بعد پرانا نظام بحال کر دیا گیا ہے۔[۲۷]

یوں طاقت ور کے لیے قانون بھی بدل دیا جاتا ہے۔

سیاسی و سماجی جبر و استحصال کے حوالے سے محمد حمید شاہد کا افسانہ ''گانٹھ''[۲۸] اور ''سورگ میں سور''[۲۹] اہمیت کے حامل ہیں۔ ''سورگ میں سور'' گیارہ ستمبر کے حوالے سے لکھا گیا ایک علامتی افسانہ ہے۔ جس میں سوروں کا بکریوں پر حملہ امریکہ کے افغانستان اور عراق پر کیے گئے حملوں کی طرف اشارہ ہے جس سے لوگوں کی جانیں گئیں اور ملک میں انتشار پھیلا۔

''گانٹھ'' افسانے میں ڈاکٹر توصیف کی کہانی بیان کی گئی ہے جو امریکہ میں رہائش پذیر تھا اور وہاں کی عورت سے شادی کر کے سکون کی زندگی بسر کر رہا تھا لیکن گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد اس کی وفاداری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے پاکستانی ہونے کی بنا پر ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ اس بات سے توصیف کے بچّوں اور بیوی کو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کا یہ رویّہ مغربی تہذیب کی سرد مہری کا واضح ثبوت ہے۔ جس سے انسان ذہنی کشیدگی، خوف اور عدم تحفّظ کا شکار ہوا۔

اکیسویں صدی میں گیارہ ستمبر کے نتیجے میں، دہشت گردی، تشدّد، نسل پرستی جیسے مسائل سامنے آئے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلاب، نجی ٹی وی چینلوں کی بھرمار، سماجی ذرائع ابلاغ کے نتیجے میں سچ کی موت ہوئی اور حقیقت سراب بنی۔ ان مسائل نے ایک طرف سماجی و ثقافتی اقدار کے زوال کی کہانی کو جنم دیا تو دوسری طرف اکیسویں صدی کے انھی مسائل کے بطن سے کچھ اچھے اور بہتر رویےّ بھی پیدا ہوئے۔ اب عام آدمی ظلم و ناانصافی کو چپ چاپ قبول کرنے سے انکار کرتا ہے؛ وہ اپنے حقوق سے آگاہی رکھتا اور ان کے لیے آواز بلند کرتا ہے۔ اگرچہ اس کے نتیجے میں اس کو ایک نئے جہنّم کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن وہ گھبراتا نہیں

ہے۔ ناصر عباس نیّر کے افسانے "راکھ سے لکھی گئی کتاب"[۳۰]، "موت کاروبار ہے"[۳۱]، "یہ خدا کہاں نہیں رہتے"[۳۲] آج کے فرد کی آگاہی، اور اس کی جرات و بہادری کی عکاسی کرتے ہیں۔

ہمارے سماجی رویّوں میں ایک بڑی مثبت تبدیلی صنفی حقوق کے حوالے سے بھی رونما ہوئی ہے۔ دنیا میں حقوق نسواں کی تحریکیں انیسویں صدی سے ہی شروع ہو چکی تھیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جنوب ایشیائی معاشروں میں بھی ان کے اثرات مرتّب ہونے لگے۔ تاہم ان اثرات کا دائرہ گزشتہ صدی کے اواخر تک محدود ہی رہا۔ معاشی طور پر خود مختار عورت کا تصوّر زیادہ قابل قبول نہیں تھا۔ عہد حاضر میں اس رویّے میں تبدیلی آئی ہے جس کی نمائندگی معاصر افسانے میں دکھائی دیتی ہے۔ نجیبہ عارف کے افسانے "ورکنگ وومن"[۳۳] میں بیان کنندہ ایک دفتر میں کام کرتی ہے۔ جس کو اپنے شوہر کا مکمل تعاون حاصل ہے مگر شوہر کسی بھی مرحلے پر اپنی اچھائی کو جتلانا نہیں بھولتا۔ اس کے باوجود عورت کی صلاحیتوں کو ماننا اور ان سے فائدہ اٹھانا کہیں امید بھرا ایک احساس جگاتا ہے۔ افسانہ نگار نے متن کے حاشیے پر ایک ایسا ہی ان لکھا احساس اجاگر کیا ہے۔ نیلم احمد بشیر کے افسانے "چارہ گر"[۳۴] میں جہاں مغربی اقدار کے مشرقی اقدار پر مرتّب ہونے والے اثرات کو واضح کیا گیا ہے، وہیں پرانی اور نئی نسل کی سوچ کا تقابل کرتے ہوئے عورت کی معاشی خود مختاری کی بھی بات کی گئی ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "لیکن بھائی اللہ کے فضل سے بھائی جان کا ٹھیک ٹھاک تو کام چل رہا ہے پھر آپ کو بوتیک کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟"
>
> انکل! آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہر کام پیسوں کے لئے ہی تو نہیں کیا جاتا۔ آخر امی اپنی ذات کی تسکین کے لئے کچھ اپنا بھی تو کر سکتی ہیں نا۔ اپنی Achievements کی بڑی بات ہوتی ہے۔۔۔
>
> زیبی ایک ماڈرن پاکستانی لڑکی تھی۔ اسلم کو اس کی اور اپنی بیٹی لیلیٰ کی سوچ میں ذرہ بھر بھی فرق محسوس نہیں ہوا۔۔۔
>
> بس اسلم بھائی I Want to find myself!
>
> بھابی نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔
>
> اور اب میں اپنے ذاتی پراجیکٹ، اپنی بوتیک کے کام سے بہت مطمئن ہوں۔ بڑا مزا آتا ہے، زندگی کے بھرپور ہونے کا احساس ہوتا ہے"[۳۵]۔

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ جدید دور میں عورت باشعور ہونے کے ساتھ اپنی الگ پہچان بھی بنا رہی ہے۔

ناصر عباس نیّر کا افسانہ "ولدیت کا خانہ"[۳۶] میں صیغہ واحد غائب کے ذریعے ایک ایسے باپ کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنے بیٹے کی ولدیت کے حوالے سے شک و شبہ کا شکار ہے۔ اس کو یقین نہیں ہے کہ یہ اس کا حقیقی یا جائز بیٹا ہے۔ افسانے کا آغاز

سائیں اور اس کے مرید کے درخت کے نیچے بیٹھے لوگوں کو کہانیاں سنانے سے ہوتا ہے۔ ان کے متعلق گاؤں کے تمام لوگ دن رات سوچتے رہتے ہیں۔ سائیں صرف ایک دو لفظ نکالتا اور اس کا مرید (شاہ صاحب) اپنی مرضی کی بلکہ یوں کہنا مناسب ہے کہ گاؤں کے لوگوں کی سوچ کے عین مطابق ان لفظوں کو کہانی کے قالب میں ڈھالتا۔ ان کہانیوں پر لوگ آنکھ بند کر کے یقین کرتے تھے۔ سائیں کے پاس قسمت کا حال جاننے کے لیے آنے والوں میں ایک ماسٹر اسمعیل بھی تھا جو اپنے بیٹے اکرم کی ولدیت کے حوالے سے شک و شبے میں مبتلا تھا۔ اس نے رازداری سے شاہ صاحب کو کہا کہ وہ سائیں سے پوچھے کہ اکرو کس کے تخم سے پیدا ہوا ہے۔ شاہ صاحب اسے کل آنے کا کہتے ہوئے بھیج دیتے ہیں لیکن ماسٹر کی بے چینی اُسے سکون نہیں لینے دیتی۔ وہ اکرم کی حقیقت بھی جاننا چاہتا ہے اور رسوائی سے بھی ڈرتا ہے۔ یہ بات پورے گاؤں میں پھیل جاتی ہے کہ اکرم اسمٰعیل کا بیٹا نہیں وہ ایک ناجائز بچّہ ہے۔ سب لوگ ماسٹر کو طعنے دیتے اور طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں جس سے ماسٹر کو سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ ردِ عمل میں گھر پر اپنی بیوی اور اکرو سے بدسلوکی کا مظاہرہ کرتا ہے تاہم اس تمام تاریک صورتِ حال سے روشنی کی ایک کرن بھی پھوٹتی ہے۔ افسانے کے اختتام پر اکرم کی گندم کی گولیاں کھا کر مرنے کی کوشش اسمٰعیل کے شعور کو جھنجھوڑ دیتی ہے؛ وہ اپنے شک کو جھٹک کر اکرم کے بچنے کی دعا کرتا ہے اور ماتھا چومتا ہے۔ ”ایک ہفتے بعد اپنے گھر میں اس نے اکرم کا زندگی میں پہلی مرتبہ ماتھا چوما، اور خیرات کی“[۳۷]۔ اسمٰعیل کا یہ رویّہ انسانی شعور کی پختگی کی علامت ہے۔

جدید دور میں ہمارے سماجی تعلّقات عدم استحکام کا شکار ہیں اور قبولیت کا عنصر لوگوں میں ناپید ہے۔ ان تمام حالات اور توہمات سے بھری دنیا میں اسمعیل کا اکرم کو قبول کرنا اور ماتھا چومنا ایک مثبت سماجی رویّہ ہے۔ اسمٰعیل کا یہ عمل، انسان دوستی پر مبنی ہے۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ تعصّبات اور توہمات کے بجائے انسانیت کا درجہ بلند ہے اور انسانیت ہر مذہب سے بڑھ کر ہے۔ جب یہ قبولیت کا عنصر معاشرے کے ہر فرد میں پایا جائے گا تو انسان ذہنی سکون سے ہم کنار ہو گا اور سماجی تعلّقات میں رواداری، برداشت، ہمدردی جیسے عناصر کو فروغ ملے گا۔

نیلم احمد بشیر اپنے افسانوں میں مشرقی اور مغربی اقدار کا موازنہ کرتے ہوئے مغربی بے اعتنائی اور مشرقی خلوص و محبّت کو واضح کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کے افسانے ”کیکٹس کا پھول“[۳۸]، ”تھوڑی کھلی اور بند آنکھیں“[۳۹] اور ”جڑیں“[۴۰] اہمیت کے حامل ہیں۔

نیلم احمد بشیر نے اپنے افسانے ”جڑیں“ میں مشرق و مغرب کی کشمکش کو موضوع بنایا ہے۔ افسانے میں ڈاکٹر موہن اپنے آبائی گھر کو دیکھنے ایمن آباد جاتا ہے جہاں لوگ اس کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ اسے مشرقی کھانے کھلاتے ہیں اور تمام جگہوں کی سیر کرواتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر کو نہیں جانتے لیکن خلوص و محبت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔ دوسری طرف جب ڈاکٹر موہن انگلستان میں

اپنے "فارم ہاؤس"، جہاں اس کا بچپن گزرا، کو دیکھنے کی غرض سے جاتا ہے تو وہ انگریز فیملی اسے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتی۔ آخر میں اس فیملی کے کہے گئے جملے مغربی اقدار کی بے اعتنائی اور خود غرضی کو واضح کر دیتے ہیں:

تم بھی خواہ مخواہ ہر ایک کے لیے دروازہ کھول دیتے ہو! نہ جانے کون ہیں کہاں سے آئے ہیں چور اُچکے ہیں!

ڈرٹی Pakis!

بڑھیا بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی اور مسٹر مچل نے جلدی سے دروازے کے پٹ بند کر لینے کے بعد حفاظتی زنجیر چڑھادی۔[۴۱]

ہمسایوں سے اچھے تعلّقات اور مشکل وقت میں ان کی مدد کرنا ہماری ثقافت کی ایک خوب صورت قدر ہے۔ نیلم احمد بشیر کا افسانہ "آندھی"[۴۲] بالا کوٹ کے زلزلے میں تباہی کا شکار ہونے والے یک خاندان کی کہانی ہے۔ تباہ حال زبیدہ، اس کی بیٹی پشمینہ اور بیٹا اسلم، لاہور میں نشاط کالونی میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ لوگ کسی کوٹھی پر کام کر کے اپنا گزر بسر کرتے ہیں اور مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں۔ ایک روز ایک حادثے میں اسلم کا انتقال ہو جاتا ہے۔ زبیدہ کے پاس پیسے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اردگرد کے غریب لوگ پیسے اکٹّھے کرتے اور اسلم کے کفن دفن کا انتظام کرتے ہیں۔

نیلوفر اقبال کا افسانہ "گھنٹی"[۴۳] مشرقی ثقافت، اور اخلاقی اقدار کی پاس داری کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ افسانے میں بہو اور بیٹا باپ کی بیماری کی وجہ سے اُسے ایک گھنٹی لے کر دیتے ہیں تا کہ ضرورت کے وقت وہ اسے بجا کر مدد کے لیے بلا سکے۔ یہ رویّہ والدین کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے۔

علی اکبر ناطق کے افسانوں میں انسان دوستی، خاندانی روابط، بزرگوں کی عزّت اور جانوروں سے محبّت جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ "شریکا"،[۴۴] "شاہ مدار کی پازیبیں"[۴۵]، اور "تابوت"[۴۶] مثبت سماجی رویّوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ علی اکبر ناطق دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جدید دور کے انسان میں اب بھی ہمدردی، احساس ذمّہ داری، خلوص و محبّت جیسی خوب صورت اقدار زندہ ہیں۔

"شریکا" میں عاقل خان اور شیرے کی دوستی، عاقل خان کا ہر صورت اپنے والدین تک پہنچنے کی خواہش اور غریبوں کی مدد کرنا مشرقی ثقافت کی اس روایت کو ظاہر کرتا ہے جہاں انسان دوستی اور خاندانی تعلق کو اہم سمجھا جاتا ہے۔

گاؤں کی غریب عورتیں اور بچے عاقل خاں کے کھوہ پر جمع تھے۔ عاقل خاں بھینسوں کا دودھ ان میں تقسیم کرنے لگا۔[۴۷]

"شاہ مدار کی پازیبیں" میں گاؤں کے لوگوں کا آپس میں مل کر بیٹھنا، کبوتر بازی کا مقابلہ، ایک دوسرے کے لیے مشکل وقت میں کھڑے ہونا خوب صورت مشرقی اقدار کو ظاہر کرتا ہے۔ چودھری کا لندن جانے سے پہلے اپنی زمینیں اچھے کے پاس رکھوا

کر جانا محبّت اور یقین کی نشانی ہے اور چار سال بعد واپس آ کر اچھے کا تمام زمینیں اور منافع کی رقم لوٹا دینا انسان دوستی، محبت اور احساس ذمّہ داری جیسی خوب صورت روایات کے زندہ ہونے کی علامت ہے۔

زمین کاشت کرتے چار سال گزر گئے۔ چودھری سال بعد آتا تو یہ اس کا حصہ اس کی جھولی میں لا رکھتا۔[۴۸]

اسد محمد خان نے افسانوں میں محمد تغلق اور شیر شاہ سوری کے دور حکومت کے بیان کے ذریعے جدید عہد کے سیاسی جبر و استحصال کو واضح کیا ہے۔ لیکن ان کے افسانوی کردار اس جبر کو برداشت کرنے کی بجائے سوال اٹھاتے اور مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدید دور کا انسان اب سماجی ناہمواری کو برداشت کرنے کی بجائے انصاف کا متلاشی ہے۔ جیسا کہ "دارالخلافہ اور لوگ"[۴۹] میں مرکزی کردار دربار میں انصاف کے لیے آواز اٹھاتا ہے۔ افسانے میں تغلق حکومت کی غیر مستحکم پالیسیوں، عوام پر ان کے ظلم و ستم کی کہانی بیان کرتے ہوئے جدید دور کے سیاسی جبر و استحصال کو واضح کیا گیا ہے۔ کہانی صنوبر نامی کردار کے گرد گھومتی ہے جس کے اپنے گھر کے اٹھارہ لوگ تغلق حکومت کے عہد میں غلط فیصلوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اب وہ اس ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کرتی نظر آتی ہے۔ واحد غائب کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ قدیم دور حکومت ہو یا جدید ہر دور میں جابر حکمرانوں کے خلاف آواز اٹھانے والے عتاب کا نشانہ بنتے ہیں اور عام انسانوں کے لیے ہمیشہ یاد رہ جانے والا ایسا قصّہ بن جاتا ہے جسے صدیوں کہانی کی صورت میں دہرایا جاتا ہے۔ افسانے میں فیروز شاہ تغلق اپنے مرحوم چچا سلطان محمد تغلق کی روح کو سکون بخشنے کے لیے اعلان کرواتا ہے کہ عوام پرچہ لکھ کر دیں کہ وہ اپنے بادشاہ کو ہر ظلم و ستم اور ہر زیادتی کے لیے معاف کرتے ہیں۔ پرچہ لکھ کر دینے والے کو دو چاندی کے سکّے بھی عنایت کیے جائیں گے۔ لوگ جو معاشی بدحالی کا شکار تھے انھوں نے ان دو سکّوں کے عوض بیان دینے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن صنوبر جاہ اپنے لوگوں کے ساتھ کیے گئے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھاتی ہے اور جب پرچہ لکھنے جاتی ہے تو اس میں لکھتی ہے کہ

> صنوبر جاہ بنت خیر الدین مرزا، رحلت کیے ہوئے بندے محمد تغلق ابن غیاث الدین شاہ کو جو برسوں پہلے ممالک ہند کا بادشاہ تھا، لاکھوں بندگان خدا کی مصیبت اور ابتلا کا اور ہزاروں کی موت کا واحد ذمہ دار ٹھہراتی ہوں اور اس منصف اول و آخر کے روبہ رو کہ جو شر کی سزا اور خیر کا انعام دینے والا حاکم مطلق ہے، محمد تغلق شاہ کو مجرم گردانتے ہوئے فریادی ہوں کہ مجھ بدنصیب کے اٹھارہ پیاروں کی الم انگیز موت کا حساب اس بادشاہ محمد تغلق سے لیا جائے۔[۵۰]

افسانے میں جہاں ہر کوئی حکم کی تعمیل کرتا ہے؛ دو روپے کے عوض خود پر ہونے والے ظلم و ستم کو تحریری طور پر معاف کرتا ہے وہیں صنوبر اس حکم سے انحراف کرتے ہوئے ظلم کے خلاف آواز اٹھاتی ہے۔

"تصویر سے نکلا ہوا آدمی"[۵۱] ایک علامتی افسانہ ہے جس میں موجودہ سیاسی صورت حال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانے

میں ایک تصویر دکھائی گئی ہے جس میں بریگیڈیئر جو کسی زمانے میں کیپٹن تھا، شونالی نام کی لڑکی کے ساتھ نظر آرہا ہے۔ بریگیڈیئر صاحب اختیار اور اس اقتدار کی علامت ہے جو معاشرے میں چند لوگوں کو حاصل ہے اور شونالی اس عوام کی علامت ہے جو معاشرے میں مسلسل استحصال کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ افسانے میں شونالی کا چیتا پالنا دراصل اس بات کا واضح اظہار ہے کہ ایک دن انسان کی اندرونی طاقت ابھر کر سامنے آئے گی اور اس ظلم و بربریت کی زنجیر کو توڑ دے گی۔ چیتا طاقت کی علامت ہے اور شونالی کا اس کو پالنا ایک ایسی امید کی کرن ہے جو ہمیں پیغام دیتی ہے کہ ذاتی شکست وریخت کو ختم کرتے ہوئے ڈٹ کر مقابلہ کرنے سے ایک دن یہ سب ختم ہو سکتا ہے۔ افسانے کا اختتام بھی امید سے بھرپور ہے جو اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب دنیا زیادہ بہتر معاشرہ بننے میں معاون ثابت ہو گی۔

> مگر میرا دوست اور میں۔۔۔۔ اور شونالی۔۔ ہم تینوں یہ بات جان گئے ہیں کہ یہ زیادہ دن نہیں چلے کیوں کہ ہر شونالی نے اپنے اپنے سادلاسیہ سے چھپ کر ایک ایک چیتا پال لیا ہے۔ ان سب کی کہانیوں میں ایک یہی بات حوصلہ دینے والی ہے۔ [۵۲]

شونالی کا چیتا پالنا اس طرف اشارہ ہے کہ انسان ایک دن سماجی ناہمواری کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گا۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نو استعماریت اور عالمگیریت کے دباؤ کے تحت سماجی و ثقافتی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، معاصر افسانہ ان کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ افسانوں میں جہاں مغربی اثرات کے تحت پیدا ہونے والی مادیت پرستی اور ثقافتی تصادم کو موضوع بنایا گیا ہے وہیں مشرقی ثقافت کے مثبت پہلو مثلاً خاندانی وابستگی، انسان دوستی اور اخلاقی اقدار کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ معاصر اردو افسانہ نہ صرف ثقافتی زوال کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ انسانی تعلّقات، پیار و محبّت جیسی اخلاقی قدروں اور انسانی وقار کی بازیافت کی امید بھی اجاگر کرتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

* (پ: ۲۰۰۲ء) ایم فل سکالر، شعبۂ اردو، کنیئرڈ کالج یونیورسٹی برائے خواتین، لاہور۔

۱۔ ریمنڈ ولیمز [Raymond Williams]، Culture and Society (نیویارک: اینکر بکس، ۱۹۵۹ء)، xvii-xvi۔

۲۔ زاور طالب چوہدری، "محمد حمید شاہد کی افسانہ نگاری" (مقالہ برائے ایم۔اے اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد، ۲۰۰۲ء)، ۲۵۔

۳۔ آصف فرخی، چیزیں اور لوگ (کراچی: حسن مطبوعات، ۱۹۹۱ء)، ۱۷۵۔

۴۔ حمید شاہد، محمد، بند آنکھوں سے پرے (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء)، ۶۳۔

۵۔ رفیع حیدر انجم، شاید نہیں (نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۲۴ء)، ۲۹۔

۶۔ محمد اکرام اللہ، جنگل (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ۵۵۔

۷۔ جمیل جالبی، پاکستانی کلچر (کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۱ء)، ۱۷۔

۸۔ آصف فرخی، میرے بھی دن گزر رہے ہیں (کراچی: اے جے پرنٹرز، ۲۰۰۹ء)، ۵۷۔

۹۔ رفیع حیدر انجم، شاید نہیں، ۳۱۔

۱۰۔ عاصم بٹ، دستک، (ندارد)، ۷۔

۱۱۔ اطہر پرویز، مرتب، اردو کے تیرہ افسانے (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۷ء)، ۱۷۹۔

۱۲۔ محمد اکرام اللہ، جنگل، ۵۵۔

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ ناصر عباس نیّر، افسانوی مجموعہ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۵ء)، ۲۸۷۔

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ صفدر حسن صدیقی، مذہبی رواداری (لاہور: مشعل بکس، س۔ن)، ۷۔

۱۷۔ عاصم بٹ، دستک، (ندارد)، ۱۔

۱۸۔ محمد حمید شاہد، بند آنکھوں سے پرے، ۶۵۔

۱۹۔ ایضاً، ۱۳۵۔

۲۰۔ ایضاً، ۵۱۔

۲۱۔ ایضاً، ۵۶۔

۲۲۔ ناصر عباس نیّر، افسانوی مجموعہ، ۲۷۷۔

۲۳۔ آصف فرخی، چیزیں اور لوگ، ۱۷۵۔

۲۴۔ رفیع حیدر انجم، شاید نہیں، ۸۱۔

۲۵۔ ایضاً، ۸۵۔

۲۶۔ ایرک فرام، صحت مند معاشرہ، مترجم: قاضی جاوید (لاہور: مشعل بکس، ۱۹۸۹ء)، ۹۵۔

۲۷۔ ناصر عباس نیّر، افسانوی مجموعہ، ۲۸۱۔

۲۸۔ محمد حمید شاہد، مرگ زار (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء)، ۷۹۔

۲۹۔ ایضاً، ۹۷۔
۳۰۔ ناصر عباس نیّر، افسانوی مجموعہ، ۳۰۲۔
۳۱۔ ایضاً، ۳۳۱۔
۳۲۔ ایضاً، ۳۳۹۔
۳۳۔ نجیبہ عارف، میٹھے نلکے (کراچی: اکیڈمی بازیافت، ۲۰۲۲ء)۔
۳۴۔ نیلم احمد بشیر، جگنوؤں کے قافلے، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ۱۶۷۔
۳۵۔ ایضاً، ۱۸۵۔
۳۶۔ ناصر عباس نیّر، افسانوی مجموعہ، ۴۱۔
۳۷۔ ایضاً، ۵۹۔
۳۸۔ نیلم احمد بشیر، جگنوؤں کے قافلے، ۳۵۔
۳۹۔ ایضاً، ۱۳۲۔
۴۰۔ ایضاً، ۵۵۔
۴۱۔ ایضاً، ۷۵۔
۴۲۔ نیلم احمد بشیر، وحشت ہی سہی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ۲۰۶۔
۴۳۔ نیلوفر اقبال، گھنٹی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء)، ۱۹۔
۴۴۔ علی اکبر ناطق، قائم دین، (ندارد)، ا۔
۴۵۔ ایضاً، ۷۔
۴۶۔ ایضاً، ۳۵۔
۴۷۔ ایضاً، ۷۔
۴۸۔ ایضاً، ۱۱۔
۴۹۔ اسد محمد خان، تیسرے پہر کی کہانیاں (لاہور: القا پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ۳۔
۵۰۔ ایضاً، ۱۰۔
۵۱۔ ایضاً، ۳۰۔
۵۲۔ ایضاً، ۴۶۔

Bibliography

Anjum, Rafee Haider.*Shāid Nahīṅ*.New Dehli: Educational Publishing House, 2024.
Arif, Najeeba. *Mīthēy Nalkēy*. Karachi: Academy Bazyaft, 2022.
Basheer, Neelam Ahmad. *Jugūon kēy Qāfilēy*. Lahore: Sang e Meel Publications, 2008.
———. *Weshat hī Sahī*. Lahore: Sang e Meel Publications, 2013.
Farrukhi, Asif. *Chīzēṅ aur Log*. Karachi: Hasan Matboat, 1991.
———. *Mērey bhi din Guzar Rahēy hēṅ*. Karachi: A. J. Printers, 2009.
Fromm, Erich. *Sehat Maṅd M'ashra*. Tran: Qazi Javed. Lahore: Mashal Books, 1989.
Hameed Shahid, Muhammad. *Band Aankhoṅ Sē Parē*. Lahore: Alhamd Publications, 1994.
Hameed Shahid. *Marg-i Zār*. Karachi: Academy Bazyaft, 2004.
Ikramullah, Muhammad. *Jaṅgal*. Lahore: Sang e Meel Publications, 1990.
Jalbi, Jameel. *Pākistāni Culture*. Karachi: National Book Foundation, 1981.
Khan, Asad Muhammad. *Tīsrē Pehar ki Kahāniaṅ*. Lahore: Alqa Publications, 2015.
Natiq, Ali Akbar. *Qāim Dīn*. n.d.
Nayyar, Nasir Abbas. *Afsānwi Majmua*. Lahore: Sang e Meel Publications, 2025.
Neelofer Iqbal. *G̱hanti*. Lahore: Sang e Meel Publications, 1989.
Perwaiz, Athar. ed. *Urdu key Tēra Afsānē*. Ali Garrh: Educational Book House, 1987.
Siddiqee, Safdar Hassan. *Maẓhabi Rawadāri*. Lahore: Mashal Books, n.d.
Talib, Zawar Chaudhary. "Muḥammad Hamīd Shāhid ki Afsāna Nigāri".Maqala Baraiy PhD, National University of Modern Languages, Islamabad, 2002.
Williams, Raymond. *Culture and Society*. Newyork: Anchor Book, 1959.